C 6/25/2024 11:20 PM PAGE 1 (1,1)

اک ستارہ اجنبی

اِک ستارہ اجنبی

مری بے خواب راتوں کی کہانی
ترے شاداب ہونٹوں پر کِھلی ہے
مِرے پہلو میں لاکھوں کہکشائیں
مگر وہ اک ستارہ اجنبی ہے

اِک ستارہ اجنبی

نظمیں، غزلیں

مجید امجد

کے نام

یہ شاعری

یہ شاعری میرا جیون ہے، ایک ایسا جیون جو میں نے نہیں گزارا، مگر اِس جیون کے لمس تک رسائی کی شدید خواہش نے اِن نظموں اور غزلوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ہم جس معاشرے میں زیست بسر کر رہے ہیں، اُس میں فرد کی رائے کہیں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ وقت کا ایک سیل بلاخیز ہے جو فرد کو بے دردی کے ساتھ بہائے لیے چلا جا رہا ہے۔

بے یقینی، بے حسی، بے بسی اور تشکیک اِس عہد کی فکر کا کچھ اِس طرح حصہ بن چکے ہیں کہ زندگی کے کسی شعبے میں کوئی آدرش، کوئی نظریہ کارآمد نہیں رہا۔ ایسے حالات میں نظریاتی انسان کا آدرش مستقل خطرات کی زد میں رہتا ہے۔ میں اور میری طرح کے لاکھوں اور انسان عام لوگوں کی سطح پر زندگی کرنے پر مجبور کر دیے گئے ہیں۔ اِس لیے میری شاعری میں در آنے والی تشکیک اور بے یقینی محض میرا ہی المیہ نہیں، بلکہ اِس ساری سوسائٹی کا المیہ ہے۔

میرا پہلا مجموعہ ''رختِ دل باندھلو '' ۱۹۹۴ء کے اوائل میں شائع ہوا تھا۔ ممکن ہے فنی وفکری سطح پر طویل مسافت اور ریاضت کا عمل آپ کو اِس مجموعے میں نظر آئے اور یہ بھی ممکن ہے کہ میرا فنکارانہ عجز پہلے سے بھی کچھ نمایاں ہو گیا ہو۔ بہر حال اِس طویل مسافت کے دوران آنکھ کے پردہ پر اُترنے والے مناظر نے ہی کبھی کسی اشک کی صورت اختیار کی ہے اور کبھی کسی نے اداسی کے لمحے کو جنم دیا ہے۔ کہیں پر یہ منظر کسی تمنا کی صورت میں دل سے باہر ٹپکا تو کسی نظم یا غزل کے پیرایہ میں تبدیل ہو گیا۔ ممکن ہے آپ اس شاعری کے مطالعے سے یہ محسوس کریں کہ اس میں ہمارے عہد کے احساسات کو پوری فنکارانہ مہارت سے نظم نہیں کیا جاسکا یا اظہار کی نارسائی شاعر کے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے اور یوں آپ اِس کو اہم نہ سمجھیں، مگر یہ شاعری میرے لیے بڑی اہم ہے کہ اِس نے میری ذات کی باطنی ٹوٹ پھوٹ کو کافی حد تک روکا ہوا ہے۔ اس نے زندگی میں مجھے مکمل طور پر بکھرنے سے بچایا ہوا ہے۔ میں جب بھی کسی دکھ کے زیرِ اثر ریزہ ریزہ ہوا ہوں، اِن نظموں نے اپنی فگار اُنگلیوں کے ساتھ مجھے ریزہ ریزہ چُنا ہے۔ شاید کسی آنے والے دکھ کا ہدف بنانے کے لیے۔ اِسی لیے میرے نزدیک یہ شاعری اس بکھرے ہوئے عہد کی نمائندگی کی اہل ہے۔

میں زندگی میں اپنی ذات کی نفی کے عمل سے اثبات کی تلاش میں مصروف رہا ہوں، مگر مجھے اِس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی، ہاں نفیِ ذات کے اِس عمل سے کوئی زرخیز لمحہ مجھے ضرور مل جاتا ہے۔ یہ تخلیقی لمحہ میری رائیگانی کو تھوڑی دیر کے لیے آنکھ سے اوجھل کر دیتا ہے تو اِسی پر اکتفا کر لیتا ہوں۔ اپنی ذات کی نفی اور انحراف کا یہ عمل چونکہ کسی صوفیانہ تجربے کا حاصل نہیں ہے، اِس لیے تخلیق کے عمل میں مشغول ہونے کے باوجود میں اسبابِ دُنیا سے بے نیاز نہیں ہوسکا کہ ایک دُنیادار ہوں، صوفی نہیں۔

میری شاعری میں آپ کو زیادہ تر اُداسی اور ہجر کے رنگ ہی نظر آئیں گے کہ میرا زندگی میں زیادہ تر اِن ہی رنگوں سے پالا پڑا ہے، اِن میں کہیں کہیں موجود وصل اور سرشاری کے رنگ ایک ایسے دور، ایک ایسے لمحے کی یادگار ہیں، جو کسی سہانے خواب کی طرح ایک پل کے لیے احساس کے کینوس پر روشن ہوا اور پھر یکا یک کسی تاریک گلی میں گم ہو گیا۔

میں نے ہمیشہ خیال کو مجرد ہنر کاری یا کرافٹ کے عمل سے زیادہ اہمیت دی ہے کہ ایک ارفع اور اچھا خیال مناسب ہنر کاری کے ساتھ بھی حیاتِ دوام حاصل کر سکتا ہے، جبکہ ہنر کاری، مناسب خیال اور حقیقی شعری تجربے کے بغیر دلوں میں جگہ نہیں بنا سکتی۔ اِس کی اثر انگیزی دماغ اور نظر کے مقامات سے آگے سفر نہیں کرتی۔ سو آپ کو میری شاعری میں کسی جگہ کرافٹ کی کمی تو نظر آسکتی ہے مگر احساس اور تخلیقی الاؤ کی نہیں کہ یہ شاعری میں نے اپنے خونِ جگر سے کشید کی ہے۔ ایک بات اور کرتا چلوں کہ مجھے اپنی شاعری، اپنے فن کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ یہ شاعری میرے عجز و انکسار کا اظہار ہے اور شاید میری عجز بیانی کا اعلامیہ بھی۔ میں پوری دیانت داری سے سمجھتا ہوں کہ بیس برس سے زائد عرصہ کی ریاضت کے بعد بھی میں ہنوز اُس ''لفظ'' اُس ''خیال'' کے انتظار میں ہوں جو میں نے ابھی لکھنا ہے، تخلیق کرنا ہے۔ یہ بیان اظہار کی حسرت کے سوا کچھ نہیں، مجید امجد نے شاید میرے ہی بارے میں کہا تھا:

بیس برس کی کاوشِ پیہم
سوتے دن اور جاگتی راتیں
اُن کا حاصل
ایک یہی اظہار کی حسرت

”

رختِ دِل باندھلو ”کاانتساب میں نے فیضؔ کے نام کیا تھا کہ فیض تخلیقی سطح پر میری پہلی محبت کی طرح ہیں اوراب” اِک ستارہ اجنبی“ کاانتساب مجید امجد کے نام کرر ہا ہوں،کہ اُن کے ساتھ محبت نہیں، درد کا رشتہ ہے ۔کاش یہ رشتہ درد سے آگے بڑھ کر اُن کی معجز بیانی کی حدودتک وسیع ہو جائے۔

”رختِ دل باندھلو“ کی طرح اِس کتاب پر بھی کسی قسم کا دیباچہ،فلیپ یارائے موجودنہیں ہے، ہاں فقط میرااظہاریہ موجود ہے۔مجھے امید واثق ہے کہ یہ اظہاریہ میری شاعری اورآپ کے درمیان دیوار نہیں بنے گا۔

ارشد نعیم

۱۶،اپریل ۲۰۱۰ء

نام کتاب: اِک ستارہ اجنبی

شاعر: ارشد نعیم

انتخاب: نوید رضا۔اظہر عباس

سرورق: اعجاز خان

کمپوزنگ: اشرف نقوی Cell No. 0345-6352439

برائے رابطہ:

ارشد نعیم

شعبہ اکاؤنٹس ، جی پی او قلعہ شیخوپورہ

Cell No. 0345-6346351

حُسنِ ترتیب

میں اجنبی، میں بے نشاں

میں پا بہ گِل!

نہ رفعتِ مقام ہے، نہ شہرتِ دوام ہے

یہ لوحِ دل ! یہ لوحِ دل !

نہ اِس پہ کوئی نقش ہے، نہ اِس پہ کوئی نام ہے!

مجید امجد

وہ جس کے نام سے روشن مری سحر بھی ہے
وہ میرا ذہن رسا بھی، مری نظر بھی ہے

درونِ خانۂ دل اُس کی آگہی اُترے
تو میں یہ سمجھوں ، مری آہ پُر اثر بھی ہے

وہ ایسا نور، کہ جس کو کوئی زوال نہیں
میں وہ چراغ ، جسے آندھیوں کا ڈر بھی ہے

دِلوں میں خواہش دنیا بھی گرچہ دیکھتا ہوں
اِنہی خرابوں میں اِک سمت تیرا گھر بھی ہے

میں سوچتا ہوں بہت دور ہے مدینہ بھی
میں سوچتا ہوں کہ یہ عمر مختصر بھی ہے

جو لَوحِ دل پہ مرے نعتِ مُصطفٰی اُتری
تو یوں لگا ، کہ سخن میرا معتبر بھی ہے

جو زخم تیرے نام کا نہیں رہا
تو دل کسی بھی کام کا نہیں رہا

میں رختِ خواب آنکھ میں سمیٹ لوں
کہ وقت اب قیام کا نہیں رہا

ہر ایک باب کھل رہا ہے آنکھ پر
غبار صبح و شام کا نہیں رہا

خموش ہوگئی بدن کی سر زمیں
وہ سلسلہ کلام کا نہیں رہا

گزر رہی ہے اِس طرح سے زندگی
کہ خوف اختتام کا نہیں رہا

نظر کو قافلہ ، دل کو غبار کرنا پڑا
یہ دشت ہم کو اکیلے ہی پار کرنا پڑا

بچالیا تھا جسے ہم نے اچھے وقتوں میں
وہ غم بھی اب کے ہمیں اختیار کرنا پڑا

یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں زندگی عزیز نہ تھی
یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں اِس سے پیار کرنا پڑا

تمہارے غم میں تو یہ آنکھ بھیگتی ہی نہ تھی
اک اور غم میں اِسے اشکبار کرنا پڑا

ہر ایک شام کسی یاد کے تعاقب میں
سمندروں کا سفر اختیار کرنا پڑا

ہر ایک خواب، ہر اک دشت سے گزارا گیا
پھر اس کے بعد فلک پر مرا ستارا گیا

تمہارا کیا ہے تمہاری تو ایک کشتی تھی
ہمارے ہاتھ سے دریا گیا، کنارا گیا

بس ایک میں تھا، مرے ساتھ میری وحشت تھی
زمیں پہ پہلے پہل جب مجھے اتارا گیا

ہماری آنکھ بھی اک خواب ہی کی نذر ہوئی
ہمارا دل بھی کسی خواب ہی پہ وارا گیا

ہمارے اشکوں سے پہلے کیا گیا روشن
پھر اس چراغ کی لو میں ہمیں اُتارا گیا

نہ جانے شہر کی گلیوں میں کیسا جادو تھا
کوئی بھی قیس نہیں دشت میں دوبارا گیا

تصویر جو دل میں ہے، دکھائی بھی نہیں ہے
پاس اور کوئی اُس کی نشانی بھی نہیں ہے

روشن بھی نہیں کرنا کسی طاقِ نظر کو
یہ شمعِ رہِ خواب بجھانی بھی نہیں ہے

اُس خواب کو تعمیر کیے جاتا ہوں دل میں
جس خواب میں یہ عمر بتانی بھی نہیں ہے

ان جاگتے بچوں کو کوئی کیسے بتائے
اب پاس مرے کوئی کہانی بھی نہیں ہے

جس درجہ مری آنکھ رواں ہے ترے غم میں
اُتنی کسی دریا کی روانی بھی نہیں ہے

پورے بھی ہمیں کرنے ہیں وحشت کے تقاضے
اِس دشت میں اب خاک اُڑانی بھی نہیں ہے

تری زمیں سے نہیں، تیرے آسماں سے نہیں
کہ اب ہمارا تعلق ترے جہاں سے نہیں

یہ گفتگو ہے کسی اور ہی زمانے سے
مِرا خطاب ترے عہدِ رائیگاں سے نہیں

اُسی کے دم سے نظر میں ہیں منزلیں روشن
وہ اک ستارہ کہ جو تیرے آسماں سے نہیں

عجیب دکھ ہے ، اُسی کو سنانا پڑتی ہے
جسے لگاؤ کوئی میری داستاں سے نہیں

بھٹک رہا ہوں ابھی ہجرتوں کے جنگل میں
میں فیض یاب ابھی بزمِ دوستاں سے نہیں

اِک اور دشت کی جانب روانہ ہوتے ہوئے
میں خود کو دیکھ رہا ہوں فسانہ ہوتے ہوئے

تمہارے خواب سے باہر پڑے رہے برسوں
تمہارے خواب کے اندر ٹھکانہ ہوتے ہوئے

بہت دِنوں سے مری آنکھ اشکبار نہیں
گرہ میں تیرے غموں کا زمانہ ہوتے ہوئے

نہ جانے کس لیے ہجرت سے مجھے پکارتی ہے
ترے نگر میں مرا آب و دانہ ہوتے ہوئے

تری قسم ہے بہت تجھ کو یاد کرتا ہے
یہ دل کسی نئے غم کا نشانہ ہوتے ہوئے

جمال احسانی کی نذر

دل جو اس غم سے آشنا ہوا ہے
اک دیا آنکھ میں جلا ہوا ہے

ایک لمحہ بھی دسترس میں نہیں
کام اک عمر کا پڑا ہوا ہے

وہ ابھی دل تلک نہیں پہنچا
آنکھ ہی میں کہیں رکا ہوا ہے

اِس میں بیعت ہیں لیلیٰ و مجنوں
ہم سے جاری جو سلسلہ ہوا ہے

ہے ابھی تیرا انتظار مجھے
ہاں ! ابھی قافلہ رکا ہوا ہے

میں جو کاغذ پہ لکھ نہیں پایا
لفظ پلکوں پہ وہ لکھا ہوا ہے

ہمیں دیکھو!

ہمیں دیکھو مسلسل خاک ہوتے
سلسلوں میں جس جگہ تارے
کسی دوری کی آہٹ پر
بہت دھیرے سے...... آہستہ
مسلسل ٹمٹماتے ہیں
ہمیں دیکھو!
گلابی آنچلوں پر گرتے اشکوں میں
کہ جن میں سُرمئی رنگوں کی جھلمل ہے

ہمیں دیکھو!

ہمارے خواب کے آباد منظر میں

جہاں گُزرے ہوئے لمحے

جہاں بِسرے ہوئے چہرے نمایاں ہیں

جہاں پر آنے والے ہجر کے کچھ دیپ روشن ہیں

ہمیں دیکھو!

کسی برباد ساعت میں

جو اِک آباد تنہائی کا حصّہ ہے

ہم عجب مسافر ہیں

رات کے مسافر تھے

چاند کے تعاقب میں

اپنے گھر سے نکلے تھے

جگنوؤں کی بستی سے

دور کا تعلق تھا

چاندنی کی خواہش میں
رات کے اندھیروں کو
دامنوں میں بھرتے تھے
دشت کی اسیری میں
صبح و شام کرتے تھے
رات کے مسافر تھے
آئینوں سے ڈرتے تھے

عمر کے آتش دان میں دیکھو

عمر کے آتش دان میں دیکھو

کیا کیا کچھ ہے؟

کتنے انگارے ہیں روشن

کتنے جل کر راکھ ہوئے ہیں

عمر کے آتش دان میں دیکھو

کوئی روشن رہنے والا لمحہ بھی ہے؟

اِس جیون کا......

بھولا بسرا ذرہ بھی ہے

عمر کا آتش دان کریدو

شاید اِن پوروں سے جا گیں

بجھے ہوئے لمحوں کی راکھ میں

زندہ رہنے والے لمحے

عمر کے آتش دان میں دیکھو

کتنے انگارے ہیں روشن !

تم کو میں کہاں رکھوں؟

اے خیالِ آئندہ !

اے جمالِ صُبحِ نو!

تم کو میں کہاں رکھوں؟

اس اُداس منظر میں

تم کو میں کہاں رکھوں؟

اِس اُداس منظر میں

تم نہیں سماؤ گے

اِس اُداس منظر میں
صرف میں سماؤں گا
کیونکہ زیست کو میں نے
شام کے چراغوں میں
ڈوبتے ہوئے دیکھا
میں نے اپنے خوابوں کو
آنکھ کی سیاہی میں
ٹوٹتے ہوئے دیکھا
اِس اُداس منظر میں
صرف میں سماؤں گا
اِس اُداس منظر میں
تم نہیں سماؤ گے
اے خیالِ آئندہ!
اِے جمالِ صُبحِ نو!

اپنی حیرت کے لیے

ایک بے انت مسافت......

بلا رہی ہے مجھے

مدھ بھری نیند سے جاگی ہوئی

آواز کے ساتھ......

کسی انجام کی جانب......

نئے آغاز کے ساتھ

اے مری آنکھ کی حیرانی تجھے......

آج کس کوہ کے اطراف سفر کرنا ہے؟

آج کس شاخ کے پہلو کو

ثمر کرنا ہے؟

خانۂ دل کے مکینو!

مری جانب دیکھو......

میری آنکھوں میں رُکے وقت کی تحریر پڑھو

کیوں یہ بے انت مسافت......

بلا رہی ہے مجھے

مدھ بھری نیند سے جاگی ہوئی

آواز کے ساتھ......

وادیٔ کالام میں ایک خیال

کبھی یہاں سے جو گزرو تو یاد کر لینا
تمہاری یاد کے سائے میں یاں سے گزرے تھے
تمہارے ہجر کے موسم یہیں گزارے تھے

ہم اپنے خواب سے بیدار جس جگہ پہ ہوئے
وہی مقام تری رہگزار ہو شاید
کسی کا تجھ کو بھی یاں انتظار ہو شاید......

ماضی اور حال کے درمیان

ہر طرف خوف کا عفریت

ہاتھ پھیلائے......

زندگی سہمی ہوئی، سمٹی ہوئی

دبکی بیٹھی ہے کسی کونے میں

کوئی چھن چھن کی ادا ہے......

نہ مغنّی کی صدا......

ہر طرف موت کا سنّاٹا ہے......

دور...... ماضی کے دھندلکوں میں کوئی

ہولے ہولے سے دبے پاؤں چلا آتا ہے

اجنبی ہے یا کوئی بھٹکا ہوا راہی ہے؟

اِس خرابے میں بھلا کون چلا آتا ہے؟

اِس خرابے میں کوئی کیسے بھلا آتا ہے؟

آنکھ اِس حیرت و ویرانی میں

پھر کسی خواب کی رہ دیکھتی ہے......

پھر کسی منظرِ گم گشتہ میں......

تیرے قدموں کے نشاں ڈھونڈتی ہے

آج پھر وقت کی تاریک گلی

تیری خوشبو کو مجسّم چاہے

پھر وہی ساز و ترنم چاہے

(جہانگیری قلعہ کے دیوانِ خاص میں)

ایک نئی منزل کی طرف سفر

خواب جو تم نے دیکھ رکھے ہیں
خواب جو میں نے دیکھ رکھے ہیں
آؤ اپنے تمام خوابوں کو
وقت کی گرد سے جُدا کر کے
ہجر کی ساعتوں میں تہہ کر کے
کسی روزن کو سونپ دیتے ہیں
آخری بار ہنس بھی لیتے ہیں
آخری بار رو بھی لیتے ہیں

(نوید رضا کے لیے)

اجنبی صدا

یہ سارا شہر یونہی تو نہیں خفا مجھ سے
چلے گا کوئی محبت کا سلسلہ مجھ سے

بچھڑ کے شہرِ تمنا سے کس طرح گزری
یہ پوچھتی ہے کوئی اجنبی صدا مجھ سے

سرخرو لمحے میں ایک نظم

چراغ بجھنے کے بعد میں جس جگہ کھڑا ہوں......
چراغ بجھنے سے پیشتر بھی یہیں کھڑا تھا
یہیں کھڑا تھا، کہ میرے باطن میں......
شک کی کوئی گرہ نہیں ہے۔
مرے یقیں پر کسی گماں کا اثر نہیں ہے......
یہ میرے پاؤں، مری بصارت، مری بصیرت
کے ترجماں ہیں......

اِسی لیے تو چراغ بجھنے سے پیشتر بھی......
یہیں کھڑا تھا......
چراغ بجھنے کے بعد میں جس جگہ کھڑا ہوں
یہیں کھڑا تھا کہ جانتا ہوں......
چراغ بجھنے سے پیشتر جو مِرا لہو تھا،
مِری جبیں تھی، مِری نظر تھی،
چراغ بجھنے کے بعد یہ سب مرے نہیں ہیں
میں جانتا ہوں، اِس ایک ساعت میں
سارا منظر بدل گیا ہے
''جو اِذن تھا میری دسترس میں
جو حرف میری پناہ میں ہے''
وہ میں نے خود ہی کسی کی جھولی میں دھر دیا ہے
کہ اپنے حصے کا جام میں نے
لہو کی بوندوں سے بھر دیا ہے۔

رائیگاں خوابوں کا نقش

نظر میں جتنے بھی رنگ بھر لوں......
وہ خواب کے رنگ سے وراہیں
وبال کی ساعتیں لیے ہیں......
نظر سے پہلوتہی کروں تو......
بدن کا میلہ......
تمہاری خوشبو کی زد میں آ کر
بکھرنے لگتا ہے......

اِسی لیے میرے پاؤں اب تک
دائروں کی مسافتوں سے بندھے ہوئے ہیں
وہ خواہشوں کے جو قافلے تھے
نہ جانے کیسی قیامتوں میں......
اُلجھ گئے ہیں۔

اُفق کے پار دیکھو !

اُفق کے پار دیکھو !
کون اپنا منتظر بیٹھا ہوا ہے
اُفق کے پار دیکھو !
کتنے منظر خون میں ڈوبے ہوئے ہیں
اُفق کے پار کتنی بستیاں......
برباد ٹھہری ہیں

اُفق کے پار کتنی حسرتیں

ناشاد ٹھہری ہیں۔

کبھی فرصت ملے تو......

ذات کے زنداں سے نکلو......

اُس طرف دیکھو!

جہاں گزرے دِنوں کی یاد رکھی ہے !

جہاں بنیاد تیری اے دِلِ ناشاد رکھی ہے !

گردِ رہ چُپ ہے، رہ گُزر خاموش
آج پھر سارے ہم سفر خاموش

اِک ستارہ سُلگتی آنکھوں سے
گر پڑا شب کی راکھ پر خاموش

اپنے حصے کے لفظ بانٹ چکے
اب تو رہنا ہے عُمر بھر خاموش

کوئی پتھر اِدھر نہیں آتا
پیڑ آنگن کے بے ثمر، خاموش

بجھ گئیں انتظار کی شمعیں
ہو گئے اپنے بام و در خاموش

اُس نے چہرہ ہی پڑھ لیا ہوگا
ہو گئے ہم یہ سوچ کر خاموش

وہ بھی خاموش آسمانوں پر
میں بھی ہوں اپنی خاک پر خاموش

یہ دل تو جگمگا دیا گیا ہے
پر آنکھ کو بجھا دیا گیا ہے

کوئی بھی اِس میں ہم سفر نہیں ہے
ہمیں جو قافلہ دیا گیا ہے

رہا نہیں ہے کچھ بھی لوحِ دل پر
لکھا تھا جو مٹا دیا گیا ہے

یہ میرے دل پہ کیسی دستکیں ہیں
کسے مِرا پتہ دیا گیا ہے

میں اپنی روشنی میں چل رہا ہوں
چراغ تو بجھا دیا گیا ہے

جو فرق زیست اور موت میں تھا
وہ فرق بھی مٹا دیا گیا ہے

یہ کس فسوں میں گرفتار ہو رہا ہوں میں
خود اپنی راہ کی دیوار ہو رہا ہوں میں

میں مٹ رہا ہوں مگر پھر بھی یہ غنیمت ہے
تری کہانی کا کردار ہو رہا ہوں میں

وہ جس کے ہاتھوں سے تعمیر ہو رہی تھی مری اُسی
کے ہاتھوں سے مسمار ہو رہا ہوں میں

یہ سوچ کر کہ کوئی میرے انتظار میں ہے
تمہارے خواب سے بیدار ہو رہا ہوں میں

وہ جس کا قرب کسی دشت کی سیاحت تھی
اُسی کا پھر سے طلب گار ہو رہا ہوں میں

✪

وہ لوریوں کی صدا کہاں ہے
گِرہ میں جو تھی، دعا کہاں ہے

چراغ بجھنے پر آ گیا ہے
ہوا کو دیکھو، ہوا کہاں ہے

ہمارے لب انتظار میں ہیں
نہ جانے حرفِ دعا کہاں ہے

کہاں گئے خواب کے وہ منظر
وہ نیند کا سلسلہ کہاں ہے

یہ رات اتنی مہیب کیوں ہے؟
دیا کہاں ہے، دعا کہاں ہے

ہمارے آنسو کہاں گرے ہیں
ہمارے غم کا صِلہ کہاں ہے

جو چِھن گئیں، منزلیں کدھر
جو کھو گیا، راستہ کہاں ہے

یہ شہر بھی شہرِ اجنبی ہے
یہاں کوئی آشنا کہاں ہے

اک مسلسل غبار میں رکھا
دل ترے انتظار میں رکھا

آنکھ رکھی سمندروں کے لیے
دل کسی ریگزار میں رکھا

جس پہ کونپل کبھی نہیں پھوٹی
خود کو اُس شاخسار میں رکھا

ہم نے اِس بار اپنی وحشت کو
دشت کے اختیار میں رکھا

اُس کو جلنا تھا میرے آنگن میں
جو دِیا رہگزار میں رکھا

زیست کا ایک سرمدی نغمہ
موت کے اختیار میں رکھا

ہم نے ٹوٹا ہوا خزاں کا سبو
اب کے جشنِ بہار میں رکھا

جلتے بجھتے چراغ نے ہم کو
عمر بھر انتظار میں رکھا

تِری یادوں کا ایک اک لمحہ
دیدۂ اشکبار میں رکھا

مایوسی اور امید کے درمیان ایک نظم

تمہیں کب لوٹنا ہے، مجھ کو لکھو!
منتظر آنکھوں کے ٹھہرے پانیوں میں......
کائی جمتی جا رہی ہے
جو منظر کل تلک تازہ تھے
دھندلانے لگے ہیں۔
یونہی بے کار بیٹھے شوق کے پنچھی بھی......
منقاروں کو زیرِ پر کیے......
گیتوں سے رشتہ توڑنے کی کشمکش میں مبتلا ہیں

ہمارے دل کا تیشہ......

وسوسوں کے رنگ کی یلغار پر......

گریہ کناں ہے۔

مِری جاں......!

قبل اِس کے گیت سب فریاد کی لَے میں

بکھر جائیں......

یہ سارے ولولے اِن راستوں کی

خاک بن جائیں......

مجھے لکھو! تمھیں کب لَوٹنا ہے۔

خالی آنکھ کا منظر

کوئی بھی کام اب باقی نہیں ہے
کوئی بھی درد اب ساتھی نہیں ہے
کوئی منظر نہیں کہ جس کی خاطر
یہ پتلی آنکھ کی ضد کر رہی ہو
مرے قدموں کے پیچھے پڑ رہی ہو
عجب بے مہر لمحوں کی اسیری
مجھے بے کیف کرتی جا رہی ہے
یہ ظرفِ عمر بھرتی جا رہی ہے

مراجعت

راکھ ہوتے ہوئے سورج سے کہو......
اپنی آغوش کو کھولے، دیکھے......
کوئی صدیوں کی مسافت سے......
پلٹ آیا ہے۔

بکھرے ہوئے لمحوں میں

میں اپنے چہرے کو ڈھونڈتا تھا......
یہ بھید آنکھوں پہ اب کھلا ہے
کہ آئینے اپنے ساتھ چہروں کو......
کرچیوں میں بدل گئے تھے۔
اسی لیے تو وہ کرچیوں میں جو
بٹ گئے تھے ، اُن آئینوں کو......
سمیٹنے میں لگا ہوا ہوں
کبھی جو فُرصت ملے تو آؤ !
یہ میری پوروں کے زخم دیکھو
کہ خون جن سے ٹپک رہا ہے

تمہاری یادوں کے راستے میں

گلاب بن کر مہک رہا ہے

وہ خواب بن کر......

جو تیری آنکھوں میں میں نے دیکھے......

جو تیرے چہرے میں کھو گئے تھے......

عذاب بن کر۔

جو ہو سکے تو اِدھر کو آؤ!

مجھے سمیٹو،

میں قطرہ قطرہ، میں ذرہ ذرہ

خود اپنی پوروں سے بہہ رہا ہوں۔

خاک پھر پکارتی ہے

گل شدہ چراغوں کی
راکھ پھر پکارتی ہے
بے اماں ارادوں کی
یاد پھر اُبھارتی ہے
رائیگاں سفر کے خواب
آنکھ میں اُتارتی ہے
خاک پھر پکارتی ہے

کیا جانے کس طرف مِری صبحیں نکل گئیں
چپکے سے مجھ کو شام کی جھولی میں ڈال کے

اپنی شالاط کے نام

مری نظمیں مقیّد ہیں تمہاری مسکراہٹ میں
تمہاری چوڑیوں کی کھنکھناہٹ میں

ذرا سوچو!
یہ نظمیں اِس گھٹن میں مر بھی سکتی ہیں
یہ ذہن و دل میں برپا شور مدھم پڑ بھی سکتے ہیں
کہیں ایسا نہ ہو جائے......
کہیں ایسا نہ ہو یہ زندگانی سرد ہو جائے
مری جاں! میری نظموں کو ذرا اِذنِ رہائی دو

ذرا سا مسکراؤ نا!
ذرا اِن چوڑیوں کو کھنکھناؤ نا!
مری نظمیں مقیّد ہیں
تمہاری مسکراہٹ میں
تمہاری چوڑیوں کی کھنکھناہٹ میں۔

وادئ کاغان کے نام

اُسی دھرتی کو چلتے ہیں

جہاں ☆کُنہار بہتا ہے

جہاں پر چیڑ کے پیڑوں میں

نغمے گنگناتے ہیں

جہاں شفاف جذبے

آبشاروں سے اُترتے ہیں

جہاں پر منظروں میں نت نئے

چہرے اُبھرتے ہیں

جہاں چشمے اُبلتے ہیں محبت کے،

وفاؤں کے

چلو آؤ اُسی دھرتی کو چلتے ہیں

جہاں فطرت کے وہ دلکش مناظر،

آنکھ میں اک آنچ بھرتے ہیں

جہاں ان لہلہاتی چوٹیوں کو دیکھ لینے سے

ترے پیکر کی مخروطی اُٹھانیں یاد آتی ہیں

چلو رختِ سفر باندھو

اُسی دھرتی کو چلتے ہیں

جہاں کُنہار☆ بہتا ہے

بازیافت

کس کی پوروں کا لمس اُترا ہے
چار جانب بدن کے صحرا میں
آبجوئے وصال جاگ اُٹھی
کاروانِ خیال و خواب سبھی
پھر درِ دل کو تھپتھپانے لگے
وہ جو اک حرفِ آشنائی

کس نے چپکے سے آنکھ میں آ کر
عہدِ رفتہ کے خواب انڈیل دیے
کس کی سرگوشیوں نے پھر سے مجھے
دل کی نگری میں جا بسایا ہے
کون میرے قریب آیا ہے

اک دیا ضروری ہے

خامشی کے جنگل میں
اِک صدا ضروری ہے
راکھ ہوتے لمحوں میں
اک دعا ضروری ہے
آ گہی کے اندر بھی
اک خلا ضروری ہے
بے چراغ بستی میں
اک دیا ضروری ہے

جانے کون چپکے سے
کان میں یہ کہتا ہے
کس اُدھیڑ بُن میں ہو
قریۂ خرابی میں
کون جان پایا ہے
کیا یہاں اضافی ہے
کیا یہاں ضروری ہے

وادیِٔ مہربان میں گُم ہوں
آج پھر اُس کے دھیان میں گُم ہوں

منزلِ گم شدہ نہیں معلوم
راستے کی چٹان میں گُم ہوں

میں بھی اس داستاں کا حصہ ہوں
میں بھی اس داستان میں گُم ہوں

وہ بھی اپنے پروں کی مستی میں
میں بھی اپنی اُڑان میں گُم ہوں

یہ زمیں میرا مسئلہ ہی نہیں
میں ابھی آسمان میں گُم ہوں

میں کسی صبح کا ستارہ تھا
شام کے آسمان میں گُم ہوں

روح آواز دے رہی ہے مجھے
اور میں جسم و جان میں گُم ہوں

وہ کسی کے جہان میں گُم ہے
میں کسی کے جہان میں گُم ہوں

اِک طرف تو ہے، اِک طرف دنیا
میں کہیں درمیان میں گُم ہوں

میرے اشکوں میں جو روانی ہے
یہ کسی ہجر کی نشانی ہے

آنکھ تحفہ ہے ایک منظر کا
دل کسی خواب کی نشانی ہے

کچھ بھی باقی نہیں ہے دامن میں
رائیگانی ہی رائیگانی ہے

کاغذی ناؤ کے مسافر ہیں
اور سمندر کی بے کرانی ہے

رائیگاں صبح کا فسانہ ہے
رائیگاں شام کی کہانی ہے

پھر وہی بے اماں مسافت ہے
پھر وہی جستجو پرانی ہے

جب بھی فرصت ملے ، چلے آنا
ہم نے اِک داستاں سنانی ہے

وصل کروٹ نئی بدلتا ہے
ہجر کا سلسلہ نکلتا ہے

ایک میں ہوں، کہ جس کی چوکھٹ پر
آندھیوں کا چراغ جلتا ہے

اک تعلق کے ٹوٹ جانے پر
ایک رشتہ نیا نکلتا ہے

تیری آواز کے تعاقب میں
راہرو راستے بدلتا ہے

یہ ہواؤں کی دسترس میں نہیں
یہ چراغ آندھیوں میں جلتا ہے

میں کسی شہر بھی چلا جاؤں
وہ مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے

سب مقیّد ہیں اس کی مُٹھی میں
وقت پر کس کا زور چلتا ہے

خاک کو خواب بنائیں گے، بکھر جائیں گے
ہم ترے دشت سے جائیں گے بکھر جائیں گے

اب بھی باقی ہے کہیں دل میں نمو کی خواہش
دل سے یہ نقش مٹائیں گے، بکھر جائیں گے

تم بھی کچھ پھول کھلاؤ گے، بکھر جاؤ گے
ہم بھی کچھ خاک اُڑائیں گے، بکھر جائیں گے

اور کچھ دیر ہے اِس شاخ پہ جیون اپنا
زرد موسم کو بلائیں گے، بکھر جائیں گے

شام کو رات کی مُٹھی سے رِہائی دے کر
شام کو شام بنائیں گے، بکھر جائیں گے

انتظار

کسی نے ساحلوں کی ریت پر
اپنی حسیں پوروں سے مجھ کو لکھ دیا ہے
اور لکھ کر بھول بیٹھا ہے
میں تنہا اور گرفتہ دل ہوا سے ڈر رہا ہوں
سمندر شور کرتا ہے......
تو جیسے دل کی دھڑکن ڈوب جاتی ہے
ہر اِک لمحے کئی لہریں......
بدن کے پاس سے ہو کر گزرتی ہیں

پرندے رقص کرتے ہیں......

کئی منظر اُفق کے دامن صد رنگ سے

مجھ پر بکھرتے ہیں......

مگر اُس بھولنے والے کے قدموں کی......

کوئی آہٹ نہیں آتی۔

وہی خوشبو نہیں آتی

کہ جس کا منتظر یہ خاکداں ہے۔

خواب گاہِ حیات

دل بھی اُس شاخ ہی کا حصہ ہے
جس پہ ہر آنے والے موسم میں
زرد پتّوں کا حُسن کھلتا ہے
نا رسائی کی فصل پکتی ہے
دِل اُسی درد کا ہے پروردہ
جو ترِے خواب کی پناہ میں ہے
جو کسی آنکھ کے حصار میں ہے
جو مری اور تیری راہ میں ہے

☆

میں ٹھیک طرح کوئی خواب بُن نہیں پایا
جگا دیا تھا مجھے صبح کے ستارے نے

بہت عجب ہے سمندر کے التفات کے بعد
قبول کی نہیں کشتی کسی سہارے نے

تجھے خبر بھی نہیں ہے دلِ مسافر کو
بہت خراب کیا ہے ترے سہارے نے

ایک نظم منجمد ساعتوں میں

ذرا دیکھو! سمے کیوں رُک گیا ہے؟
سمے کو کیسے رُکنا آ گیا ہے......
ذرا دیکھو! سمے کی باگ کس نے تھام لی ہے
سمے نے ہار کیسے مان لی ہے......
ذرا دیکھو!
ہماری آنکھ کیوں پتھرا گئی ہے......
ہمارے اشک بہتے کیوں نہیں ہیں......
ذرا سوچو!

یہ کس افسوں میں ہم تم منجمد ہیں
کوئی بولو! کہ ہم کو علم ہو جائے......
سماعت بھی ہمارے ساتھ ہے......
یا وہ بھی ہجرت کر گئی ہے
ذرا سوچو!
ہمارے خواب کس کی قید میں ہیں......
ہماری آنکھ کس کی منتظر ہے......
ذرا دیکھو!
سمے کیوں رُک گیا ہے؟

آخری مکالمہ

سنبھل ذرا اے زندگی
ذرا سا اور صبر کر
کہ اب ہیں منزلیں نظر کے
سامنے
مسافتوں کے دکھ ذرا سے رہ گئے
بہت ہی تھوڑا فاصلہ ہے درمیاں
اذیتوں کے اِس سفر کا وقتِ اِختتام ہے
بس ایک خونی شب کا انتظار ہے

پھر اُس کے بعد تیری اور منزلیں
پھر اُس کے بعد اپنے اور راستے
پھر اُس کے بعد اور ہی کسی طرف کو جائیں گے
جو آنکھ سے وراہے، ہم اُسی نگر کو جائیں گے
سنبھل ذرا اے زندگی!
ذرا سا انتظار کر
ہمارا اعتبار کر

نہ جانے کیسی رات ہے !

گِرہ میں جتنے خواب تھے
سب ایک ایک کر کے خرچ ہو گئے
قلم میں جتنے حرف تھے
وہ معتبر نہیں رہے
نظر نظر نہیں رہی
بصارتیں نہ جانے کس غبار میں اُلجھ گئیں
وہ آنکھ بھی نہیں رہی
کہ جس میں تیرے رنگ تھے
وہ خواب بھی نہیں رہے

جو خواب تیرے خواب تھے
زمیں اُجڑ کے رہ گئی
فلک بھی خالی ہو گیا
فضا بہت خموش ہے
ہوا کی سرسراہٹیں نہیں رہیں
مسافرانِ شوق کے
دِلوں میں جو اُبھرتی تھیں
وہ آہٹیں نہیں رہیں
وہ پنچھیوں کے گیت کس نگر گئے
مسافرانِ دل کہاں نکل گئے
تجھے بھی کچھ خبر نہیں
مجھے بھی کچھ خبر نہیں
یہ رات کیسی رات ہے؟
کہ جس کے آس پاس میں
کہیں پہ بھی
ستارۂ سحر نہیں

ہو گئے راکھ تو ہمارے بعد

ہو گئے خاک تو کھلا ہم پر
آسمانوں کے در مقفل تھے
رائیگاں اپنی سب دعائیں تھیں
زندگی خواب میں مقید تھی
قافلے ہجر کی امانت تھے
راستے دھول کی ضرورت تھے
زندگی چھن گئی تو جیون کے
سارے رستے کشادہ ہونے لگے

ہو گئے راکھ تو سبھی منظر
تیری صورت میں پھر سے ڈھلنے لگے
درد پھر اپنے ہاتھ ملنے لگے
ہم تہی دامنوں کی بستی میں
تیری آنکھوں کے پھول کھلنے لگے
شب کی پلکوں پہ دیپ جلنے لگے
ہو گئے خاک تو ہمارے بعد
اپنی بستی کے دن بدلنے لگے

کسی منتظر لمحے کی چاپ

ایک آہٹ سی اُبھرتی ہے کہیں شام ڈھلے
ایک سایہ سا نکلتا ہے مِری آنکھ کے پاس
ایک زنجیر سی پڑتی ہے درِ دل کے قریب
اور پھر خواب سے آنکھوں میں بکھر جاتے ہیں
درد بے کار تمنا کے اُبھر آتے ہیں

فاصلے تیرے مرے بیچ بڑھے جاتے ہیں

میں کسی نور کی ساعت میں کھڑا تیرے لیے

شام کو صبح کی دہلیز پہ لے آیا ہوں

شدّتِ درد سے بے تاب ہوا جاتا ہوں

اِک نئے شہر کو آباد کیے جاتا ہوں

اک گلاب باقی ہے

جھیل کی اداسی میں
بے دلی کی دلدل پر
بے خبر سے منظر میں
درد کے سمندر میں
ایک یاد باقی ہے

آنکھ میں خزاں رت ہے
گرد اُڑتی رہتی ہے
پھر بھی ایک کونے میں
اک گلاب باقی ہے
ایک یاد باقی ہے

جھیل صد پارہ پر ایک خیال

میں ان حسیں وادیوں کے اندر
میں اِن حسیں منظروں کے اندر
کہیں نہیں ہوں
کہیں نہیں ہوں کہ خود کو دیکھوں
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ میری ہستی
کہیں خلاؤں میں ریزہ ریزہ بکھر گئی ہے
میں سوچتا ہوں
کمالِ حُسنِ جہاں کے اندر

میں بے حقیقت، میں بے بضاعت......

کہیں نہیں ہوں

میں اِن حسیں منظروں کے اندر......

کہیں نہیں ہوں

میں اِن حسیں وادیوں سے باہر

بہت ہی بے رنگ سلسلوں میں پڑا ہوا ہوں

جہاں مری آنکھ تک نہیں ہے

جہاں ترا خواب تک نہیں ہے

بس ایک خاموش سی فضا ہے

بس ایک بکھرا ہوا جہاں ہے

بس اک سکوتِ ابد نشاں ہے

☆(سکردو کی جھیل)

ایک نظم ہارے ہوئے دن کے لیے

دن نکلتے ہی کسی رات کے......

زانو سے لپٹ جاتا ہے......

کسی سہمے ہوئے، مدقوق سے بچے کی طرح

جس کی آنکھوں میں......

کسی خوف کا تیشہ ہو گڑا......

آنکھ کھلتی ہے تو میں دیکھ کے......

ڈر جاتا ہوں......

آج یہ پھر کوئی ماتم کی خبر لایا ہے
پا شکستہ کے لیے حکمِ سفر لایا ہے
دن فرستادۂ شب ہے پھر بھی
میرے خوابوں کے لیے رزقِ ہنر بنتا ہے
بے خبر دل کے لیے تازہ خبر بنتا ہے

عجب زندگی ہے

وہی آرزو ہے
وہی جستجو ہے کہ جس میں خجل ہیں
ترے بعد اب تک
وہی خاک کا پیرہن ہے
وہی درد دل میں
وہی خواب آنکھوں میں ٹھہرا ہوا ہے
یہ آنکھیں کسی اور منظر کی خواہش میں
پتھرا گئی ہیں

درختوں کی شاخیں
ثمر اور پتوں کی فرقت کے نوحے
رقم کر رہی ہیں
اِک انجانی ساعت
اِک انجانی منزل
اِک انجانا چہرہ تسلسل سے مجھ کو
صدا دے رہا ہے
مِرا دل مقیّد، مِری جاں مقیّد
مِرے پاؤں زخمی
عجب بے بسی ہے
مِرے چار جانب جو پھیلی ہوئی ہے

یہ فقط تجھ کو گماں ہوتا ہے
وقت خاموش کہاں ہوتا ہے

اس نگر کون جلاتا ہے چراغ
اس نگر صرف دھواں ہوتا ہے

وہ جگہ ریت سے بھر جاتی ہے
جس جگہ میرا نشاں ہوتا ہے

ایک ہی قصّہ کئی صدیوں سے
ترے ہونٹوں سے بیاں ہوتا ہے

کس طرح خواب نمو پاتے ہیں
کس طرح اشک رواں ہوتا ہے

ایک لمحہ ہے مرے سینے پر
جس طرح کوہِ گراں ہوتا ہے

کوئی تھک ہار کے سو جاتا ہے
کوئی منزل کو رواں ہوتا ہے

جو گر گئے ہیں شاخ سے گلاب دیکھ!
یہ خاک میں ملے ہمارے خواب دیکھ!

گہن گئے جو تیرے انتظار میں
ہماری آنکھ کے وہ ماہتاب دیکھ!

تو ڈوبتے ہوؤں کی داستان سُن
یہ سطحِ آب پر بنے حباب دیکھ!

رقم ہیں جتنے آگہی کے باب میں
کتابِ زیست کے وہ سب عذاب دیکھ!

بس اک ذرا ہماری داستان سُن
بس اِک نظر ہمارا اضطراب دیکھ!

دکھائی دینا ہے اس اجنبی ستارے کو
یہ دیکھتے ہیں، کہاں پر دِکھائی دیتا ہے

تجھے خبر ہے، تری داستاں کا ہونا بھی ہمارے
حسنِ بیاں پر دِکھائی دیتا ہے

کبھی پہنتا ہے وہ ساحلوں کی خاموشی
کبھی وہ آبِ رواں پر دِکھائی دیتا ہے

سمیٹ لو اِسے دل میں ، کہ آخری منظر
ہمارے شیشۂ جاں پر دِکھائی دیتا ہے

کبھی کبھی کوئی کھلتا ہے آنکھ پر منظر
کبھی کبھی وہ یہاں پر دِکھائی دیتا ہے

تِرے جہان کو اپنا جہاں بنائیں گے
یہ بے نشاں کوئی نام و نشاں بنائیں گے

چُنیں گے پہلے ستارے تمہاری پلکوں سے
پھر اُس کے بعد نیا آسماں بنائیں گے

سمندروں کے سفر پر نکلنے سے پہلے
تِرے خیال کو ہم بادباں بنائیں گے

بہت دنوں سے یہی فکر کھائے جاتی ہے
کہ تیرے بعد ٹھکانہ کہاں بنائیں گے

کریں گے خود ہی مکمل یہ زندگی کا کھیل
دِیا بنائیں گے، اُس کا دُھواں بنائیں گے

پہنچ گئے ہیں اب اس عشق کے کنارے پر
گزر رہی ہے جہاں خواب کے سہارے پر

میں اپنی دھن میں مگن تھا، مجھے خبر نہ ہوئی
پکارتا تھا کوئی دوسرے کنارے پر

مِرا وجود بھی شامل ہے ان درختوں میں
جو سانس لیتے ہیں اک دشت کے سہارے پر

مِلا ہے آج وہ پَو پھوٹنے کے منظر میں
میں ڈھونڈتا تھا جسے شام کے ستارے میں

گئی رتوں میں، مرے دل میں ڈوبنے والے
اُبھرنے والے ہیں اک دوسرے نظارے میں

ہمیں خبر ہے کہ اب کے سفر نہیں آسان
ہمیں خبر ہے، بکھر جائیں گے ہمارے پر

کسی بے اختیاری کے سفر میں

اِنہیں سیّارگاں کے ساتھ شب بھر
زمیں کے گرد چکر کاٹتے ہیں
ہمارے ہاتھ میں بھی کچھ دیے ہیں
ہوا کے ہاتھ میں بھی کچھ دِیے ہیں
کسی زنجیر سے وہ دن بندھا تھا
کسی زنجیر سے یہ شب بندھی ہے

کوئی بے خواب ساعت ہے کہ جس میں
ہمارا اور تمہارا دل بندھا ہے
اِنہیں سیّارگاں کے ہاتھ میں زیست
کسی گردش کی صورت میں رواں ہے
اِسی بے اختیاری کے سفر میں
نہ جانے میں کہاں ہوں، تو کہاں ہے؟

سفرِ لاحاصل

عجب ہیں ہمسفر مرے
کسی کو کچھ خبر نہیں
کہ زندگی کا راستہ کہاں پہ ہے
یہ ظلمتوں کی سرزمیں کہاں تلک
وہ روشنی کا سلسلہ کہاں پہ ہے
کہاں پہ ہے محبتوں کی سرزمیں
کسی کو کچھ خبر نہیں

یہ بے خیال قافلے کی راہ پر
کسی خیال سے ورا
ترے جمال سے ورا
یہ وقت کے غبار میں اٹے ہوئے
نہ جانے کس خیال میں رواں دواں
نہ جانے کس دیار کی طرف چلے
عجب ہیں ہمسفر مرے

بادبان کھلتا ھے

وقت اک سمندر ہے
اور اِس سمندر میں
اپنی عمرِ آوارہ
بادبانی ناؤ ہے
بادبانی ناؤ میں
بادبان کھلنے پر
کس طرف کو جائیں گے
کوئی طے نہیں ہوتا

جس طرف ہوا چاہے
اُس طرف کو لے جائے
جس طرح کوئی پتّا
شاخ سے جدا ہو کر
زندگی کی گلیوں میں
مارا مارا پھرتا ہے

مجھ کو یہ خبر ہے دوست !
تجھ کو بھی خبر ہوگی
وقت کے سمندر میں
بادبانی ناؤ کے
ہم سبھی مسافر ہیں

عمر کی مسافت میں
جب کسی پڑاؤ پر
کوئی اجنبی لمحہ
کوئی اجنبی چہرہ
آنکھ میں ٹھہر جائے
روح میں اُتر جائے
قریۂ اُداسی کے
خاک اڑاتے منظر میں
پھول کھلنے لگتے ہیں

یہ بھی اک حقیقت ہے
قربتوں کے رنگوں میں

رنگ اِک جدائی کا
ساتھ ساتھ چلتا ہے

جس جگہ ملن رت ہے
اُس جگہ جدائی ہے
جس جگہ جدائی ہو
اُس جگہ اُداسی ہے
جس جگہ اُداسی ہو
آنکھ نم تو ہوتی ہے

آج اِس اُداسی میں
آج اِس جدائی میں
ہونٹوں پر دعا بھی ہے
آنکھ میں نمی بھی ہے
وقت کے سمندر میں
بادبانی ناؤ کا
بادبان کھلتا ہے

(بشریٰ کے لیے)

میں اپنی ہی خاک پر کھڑا ہوں

میں رات کے درد کا صِلہ تھا
میں صبح کے خواب کا گِلہ ہوں
میں اپنے ہی رنگ میں کھلا تھا
میں اپنے ہی رنگ میں جھڑا ہوں
میں اپنی ہی خاک پر کھڑا تھا
میں اپنی ہی راکھ پر پڑا ہوں

نئی صدی کی دہلیز پر

تمہیں خبر ہے!
پرانی صدیوں کی راکھ پر اب
نئی صدی کی بِنا پڑے گی
پرانی بنیاد ختم ہو گی
نئے زمانے، نئی کہانی رقم کریں گے
پرانے رشتے، پرانے قصے، پرانے چہرے
سمے کی مٹی کا رزق ہوں گے
مجھے یہ ڈر ہے......

کہ اِس بدلتے ہوئے تناظر میں

اِبدلتے ہوئے سمے میں

تمہارے مرے جو درمیاں ہے

وہ اک تعلق......

وہ ایک رشتہ بھی پچھلی صدیوں کی راکھ

کا پیرہن نہ ٹھہرے

میں وقت کی بے مہار دیمک سے ڈر رہا ہوں

سمے کی دیمک تو سارے چہروں کو،

سارے رشتوں کو چپکے چپکے نگل رہی ہے

غبار آلود منظر

طلسم ٹوٹے تِری نظر کا تو ہم بھی دیکھیں
کہاں گئے قافے ہمارے
کہاں پہ اسباب لُٹ گیا تھا
کہاں پہ ہم تنہا رہ گئے تھے
طلسم ٹوٹے تِری نظر کا تو ہم بھی سوچیں
کہ اب صدائے جرس کہاں ہے؟

ہمارے ارماں، جو در بدر تھے
کدھر گئے ہیں
ہماری آنکھوں سے گرنے والے
وہ سارے منظر کہاں گئے ہیں؟

مِری عمرِ رفتہ

سفر در سفر ہے
یہ ہاتھوں کی مٹی
یہ لب کا پیالہ
یہ آنکھوں کا دیپک

کہاں معتبر ہے!
ان آنکھوں کی نسبت
یہ ہاتھوں کا رشتہ
یہ لب کا تعلق

بہت بے اثر ہے
نوائے پریشاں
مِری نغمہ خوانی
تِری لن ترانی

بہت مختصر ہے
یہ بکھرا ہوا دن
وہ ٹوٹا ہوا پل

کوئی کہہ رہا ہے
کوئی سن رہا ہے
اِس زیست کی
ان سُنی سی کہانی

اِسی موڑ پر تھی
تِری عمرِ رفتہ
تری رائیگانی
مِری عمرِ رفتہ
مِری رائیگانی

ایک منظر

ایک بے نام سی خلش کے ساتھ
زیست کی دھوپ کاٹ دی ہم نے
اور اب شام کے دھندلکے میں
کچھ پس انداز روشنی کے ساتھ
اپنی ہستی کے ملگجی لمحے
نیم تاریکیوں سے چُنتے ہیں

☆☆☆

خامشی کی دبیز چادر میں
ایک افسردہ اجنبی منظر
رائیگاں سلسلوں سے ہوتا ہوا
میری آنکھوں کی سمت بڑھتا ہے

○

تیرے عارض کے شبنمی موتی
میرے دامن کے خشک صحرا میں
ایک اک کر کے گرتے جاتے ہیں

○

ایک بے نام سی خلش اب بھی
مرے دل کے نگار خانے کے
نیم تاریک منظروں میں ہے

○

ایک بے نام سی خلش کے ساتھ
کتنے موسم گزار بیٹھے ہیں !
کتنے موسم گزارنا ہیں ابھی ؟

بے نام زندگی کا نوحہ

وقت کی راکھ پر گرنے والوں کا
کوئی نام و نسب نہیں ہوتا
اپنے مدار سے نکل کر خلا میں
دربدر ستاروں کو
کوئی کہکشاں قبول نہیں کرتی
وہ منزلوں کی جستجو میں راکھ ہو کر

خلا میں بکھر جاتے ہیں
میں بھی کسی دل کے مدار سے
نکلا ہوا ستارہ ہوں
اِس لیے میری بھی کوئی منزل نہیں
کوئی دل مجھے پناہ دینے پر تیار نہیں
میری کوئی شناخت نہیں
میری کوئی پہچان نہیں
کیونکہ وقت کی راکھ پر
گرنے والوں کا کوئی نام و نسب نہیں ہوتا

(نثری نظم)

اے مرے مسافر سن!

اے مرے مسافر سن
شام ڈھلنے والی ہے
اور رات کا دامن
ایک اژدہے کی طرح
اپنے دہن کو کھولے
منتظر تمہارا ہے
اب کہاں پہ جاؤ گے

اے دلِ مسافر تم
اب کہاں پہ ٹھیرو گے
زادِ ہجر میں تم نے
اِک چراغ کی لَو تک
آنکھ میں نہیں رکھی
اب کہاں پہ جاؤ گے
دل کہاں پہ ٹھہرے گا
دشتِ نارسائی کا
غم کہاں پہ ٹھہرے گا
آنکھ میں جو اُبھرا ہے
غم کہاں پہ ٹھہرے گا
وقت کے تلاطم کا
سم کہاں پہ ٹھہرے گا
اے مرے مسافر سن!
شام ڈھلنے والی ہے

شہرِ خموشاں سے گزرتے ہوئے

کوئی بے رحم فسوں کار......
پسِ پردۂ خاک
ہر سخن ساز کو......
خاموش کیے جاتا ہے
کتنے خوش رنگ......
حسیں چہروں کو......

خاک بر دوش کیے جاتا ہے
نغمہ گر جو بھی......
یہاں آجائے......
اُس کو خاموش کیے جاتا ہے

وقت

وقت بے رحم سمندر ہے......
کہ جس کے تن پر
کسی وحشت نے قدم رکھے ہیں
کسی خونبار زمانے کا ستم اُترا ہے
وقت تو ڈار سے بچھڑی ہوئی......
اِک کُونج ہے جو
کسی بے کار تمنا میں گھلی جاتی ہے۔

وقت اُس خواب کی تجسیم ہے جو
ادھ کھُلی آنکھوں میں چپ چاپ اُتر آتا ہے
وقت کیا کیا ہے......
ابھی مت پوچھو
وقت کے داغ بہت ہیں......
جو ابھی دھونے ہیں
وقت کے تیر بہت ہیں......
جو ابھی سہنے ہیں
لحن میں لفظ بہت ہیں
جو ابھی کہنے ہیں

کہاں گیا وہ قافلہ

ہے دَورِ اِبتلا وہی
زمین کربلا وہی
وہی کڑکتی دھوپ ہے
وہی جھلستی ریت ہے
جلے ہوئے خیام ہیں
وہی صدائے العطش
وہی صدائے الاماں
اُسی طرح سے زندگی
غبار میں اٹی ہوئی
اُسی طرح ابھی تلک

مغائرت کے سلسلے
بس ایک شَے کہیں نہیں
وہ ایک غم کہیں نہیں
کنارِ چشمِ خوابِ دل
وہ ایک نم کہیں نہیں
وہ قافلہ کہیں نہیں
کہ جس کی گردِ راہ سے
ابھی تلک ہرے بھرے ہیں
زخم پات پات کے
کئی زماں گزر گئے
میں ساحل فرات پر
کھڑا ہوں انتظار میں
کہاں گیا وہ قافلہ
کہاں گئے وہ راہ رو
ہے ابتلا اُسی طرح
یہ کربلا اُسی طرح

خوابوں کی رھگزار میں

خوابوں کی رہ گزار میں
ہم نے کسی مقام پر
تجھ کو پکارنا بھی تھا
لمحہ کوئی وصال کا
مل کر گزارنا بھی تھا
ہم نے کسی خیال کو
دل میں اتارنا بھی تھا

لیکن یہ کیا ہوا کہ تم
تنہا سفر پہ چل دیے
وہ جو کئی چراغ تھے
دیدہ و دل کی راہ میں
جلنے سے پہلے بجھ گئے

اک صدا کی دُوری پر

اجنبی نہیں ہیں ہم
اجنبی نہیں ہو تم
پھر بھی دونوں ملتے ہیں
اجنبی فضاؤں میں

☆☆☆

اپنی آنکھ میں گم ہیں
رنگ آشنائی کے
اپنی منزلوں کا نشاں
فاصلے جدائی کے

☆☆☆

وقت کے سمندر میں
زیست کا تلاطم ہے
کاغذی سفینہ ہے
اور ہم مسافر ہیں

☆☆☆

کوئی پوچھتا ہے مجھے
کون سی جگہ ہے یہ
کون سی یہ منزل ہے
اک طویل خاموشی
اک طویل سنّاٹا
شاید اِس خرابے میں
وقت کی ندا نے ہمیں
پتھروں میں بدلا ہے

☆☆☆

نا رسا تمنائیں
میرے خواب کا حصہ
نا رسا تمنائیں
تیرے خواب کا حصہ
اجنبی فضاؤں میں

☆☆☆

اِک ستارہ اجنبی

مری بے خواب راتوں کی کہانی
ترے شاداب ہونٹوں پر کِھلی ہے
مِرے پہلو میں لاکھوں کہکشائیں
مگر وہ اک ستارہ اجنبی ہے